اپنے کلام کے متعلق غالبؔ کی پیش گوئی

تا زدیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن
ایں مے از قحطِ خریداری کہن خواہد شدن

مدتِ دراز تک میرا کلام گلدستۂ طاقِ نسیاں بنا رہے گا۔ لیکن کیا مضایقہ ہے جس کلام میں لطیف انداز سے بیان کیے ہوئے حقائق ہوں فنِ لطیف کے جواہر پارے ہوں۔ جو کلام حکمت کا گنجینہ ہو، فطرت کا آئینہ ہو، اس کی مثال شراب کی سی ہے۔ دنیا کی اکثر چیزیں کس مپرسی میں فنا ہو جاتی ہیں۔ مرورِ ایّام سے ان میں فرسودگی آجاتی ہے۔ لیکن اچھی شراب کو اگر کوئی تہ خانے میں رکھ کر مدّتِ مدید تک بھول جائے تو اس کی قدر و قیمت میں اور اضافہ ہو جائے گا۔ جب کبھی کسی مے خوار کے ہاتھ لگے گی وہ اس سے سرمست ہو جائے گا۔ اکثر شعراء، علماء، مصنّفین اور صاحبانِ کمال جن کی کماحقہٗ قدردانی ان کی اپنی زندگی میں نہیں ہوتی۔ اسی سہارے پر جیتے اور خلّاقی میں مصروف رہتے ہیں کہ ایک زمانہ آئے گا جب انقلاب اور ارتقا کے بعد متاخرین کی توجہ اس طرف منعطف ہوگی۔ شکایتِ زمانہ کے لئے مسلمان شعراء میں یہ روایت قائم ہوگئی کہ خدا کی تو شکایت نہیں کر سکتے لہٰذا زمانے کی شکایت کی جائے۔ اور سب و شتم کے لئے فلک کو ہدفِ ملامت بنا لیا۔ ایک مشہور حدیث قدسی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "زمانے کی شکایت نہ کرو، اسے بُرا نہ کہو کیونکہ زمانہ میں ہی ہوں" لاتسبوا الدھر فانی انا الدھر۔ لیکن جن اہلِ کمال شعرا کو زمانے نے داد نہ دی اُنھوں نے یہ تعلیم فراموش کر دی اور اپنے دل کی بھڑاس فلک پر نکال دی۔ غالبؔ کہتا ہے فلک جو بخیل اور لئیم مشہور ہو گیا ہے کہ اہلِ کمال کو کچھ دیتا نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا خزانہ میں ہی تھا۔ وہ مسکین اسے

کہیں رکھ کر بھول گیا۔ تہی دست ہو جانے سے کسی کو کچھ دے نہ سکا۔

؎ در لئیمی شہرۂ دہر از تہی دستیست چرخ
رفتہ مسکیں راز یاد و گنجِ پنہانش منم

اب اس پیش گوئی کے مطلع میں یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ اگر زمانہ مجھے مدّتِ دراز تک فراموش کر دے اور اسے یاد نہ رہے کہ غالبؔ کیا تھا اور کون تھا تو اس میں فائدے ہی کا پہلو نکلتا ہے۔ طویل عرصے کے بعد جب بھی یہ شراب مے خواروں کے ہاتھ لگے گی وہ اس سے مزید لذّت حاصل کریں گے۔

غالبؔ کی قدر خود اپنے زمانے میں کافی تھی پھر بھی کم از کم اردو کلام کی حد تک لوگ ذوقؔ کو زیادہ داد دیتے تھے۔ اس کی صنّاعی کی اپیل عام تھی۔ زبان کا چٹخارا اس میں بہت تھا۔ ذوقؔ بادشاہ کا استاد تھا۔ غالبؔ کا اردو کلام مشکل اور جابجا معمّائی تھا۔ بادشاہ قدردانی کرتا بھی تو غالبؔ کو کیا مل جاتا۔ بہادر شاہ خود شاہِ شطرنج تھا جس کی حکومت قلعے کے اندر محدود تھی اور اس کی آمدنی قلعہ والوں کے لئے بھی مکتفی نہ تھی۔ ابھی یہ زمانہ نہ تھا کہ عوام کی قدرشناسی حکومت کی بے توجہی، بے بسی اور بے بضاعتی کی تلافی کر سکتی۔ غالبؔ اپنے آپ کو فارسی کا شاعر سمجھتا تھا اور فارسی کلام کی داد دینے والے اس زمانے میں بھی اردو کے مقابلے میں بہت کم تھے۔ اس کا اردو کلام جس نے طبع کیا اس نے غالبؔ کو ایک نسخے کے سوا کچھ نہ دیا۔ اقبالؔ کی قدردانی اس کی زندگی ہی میں اس قدر ہوئی کہ اس کے لیے کوئی وجہِ شکایت نہ ہونی چاہئے تھی۔ لیکن وہ بھی کہتا ہے کہ

"من صدائے شاعرِ فرداستم"

عمر خیّام کی رباعیات کے انگریزی ترجمے کا شاہکار فٹز جیرالڈ کا ایک غیر معمولی ادبی کارنامہ تھا۔ لیکن جس کتب فروش نے اسے طبع کرایا وہ اس کے چند نسخے بھی فروخت نہ کر سکا۔ قحطِ خریداری کی نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اس نے قیمت نصف

SALEEM LIBRARY
I/S Sher...wa... Gate,
Line Suchau K... Lahore.

کر دی پھر بھی کسی نے اسے قابلِ توجہ نہ سمجھا۔ آخر تنگ آکر اس نے بہت سے نسخے باہر سڑک کے کنارے غیر فروختہ انبار میں رکھ دیے اور قیمت ایک آنہ کر دی۔ مشہور مصور اور شاعر روزیٹی اس ڈھیر کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اس کی نظر اس کتابچے پر پڑی، اُٹھا کر اسے پڑھنے لگا۔ پڑھتے پڑھتے مسرور بلکہ مسحور ہو گیا۔ وہیں پوری رباعیات پڑھ ڈالیں۔ اور اس کے بعد ایک کتاب خرید لی۔ اس نے شاعروں، ادیبوں اور نقادوں سے اس کا تعارف کیا اور اس کا چرچا شروع ہوُا۔ اس کے بعد سے آج تک اس کے بے شمار مزیّن اور مصور اڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور یہ نسخے دس دس، بیس بیس پونڈ میں بکے ہیں۔ اب یہ ترجمہ ادب عالیہ میں شامل ہے اور اسے انگریزی ادب کے عالم میں بقائے دوام حاصل ہو گئی ہے۔ غالبؔ سے بھی کچھ ایسا ہی معاملہ پیش آیا اسے اپنے اردو اور فارسی کلیات سے کچھ نہ ملا۔ مغلوں کی بساط اُلٹ گئی، قدیم دہلی کی تہذیب، تمدّن، دولت اور علمی وفنّی ثروت غارت ہو گئی۔ تاجر انگریزوں کی حکومت کا دور آیا، جنھیں اردو فارسی کی شاعری سے کیا لگاؤ ہو سکتا تھا، لیکن ادیبوں، شاعروں، شرح نویسوں اور نقادوں میں اس کی قدر دانی شروع ہو گئی۔ غالبؔ کو حقیقت میں حالؔی نے "یادگارِ غالبؔ" لکھ کر روشناس کرایا۔ اس کے بعد جو اٹھا اس نے شرح لکھنی شروع کر دی۔ یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے اور امید ہے کہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔ ان شارحین میں بعض ایسے بھی ہیں جو بہ لحاظ استعداد سخن فہمی سے کوسوں دور ہیں۔ ایک صاحب نے انگریزی میں غالبؔ پر کتاب لکھ ڈالی۔ وہ نہ غالبؔ کو سمجھ سکتے تھے اور نہ اردو یا فارسی شاعری سے انھیں دور کا علاقہ تھا۔ کسی نے غالبؔ کو آسمان پر چڑھا دیا۔ کسی نے طیش میں آکر محض جہالت سے اسے زمین پر پٹک دیا۔ غالبؔ اس کے متعلق بھی پیش گوئی کر گیا تھا کہ میرے کلام سے ایسا ہی برتاؤ ہو گا۔ قسم قسم کے لوگ اسے سمجھنے اور سمجھانے کے مدعی ہوں گے۔ شعر کو پرکھنے کے لئے ان میں مطلقاً کوئی بصیرت نہ ہو گی اور اندھے ہونے کے باوجود آئینۂ دعویٰ ہاتھ میں لیے پھریں گے کہ

آؤ تمھیں اس میں غالبؔ کے کلام کے محاسن دکھائیں۔ شرحیں لکھ کر زلفِ سخن کی مشاطگی کا دعویٰ کریں گے، لیکن ان کے ہاتھ شَل ہوں گے جو کنگھی نہ پکڑ سکیں۔ یہ پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔

؎ چشمِ کور آئینۂ دعویٰ بکف خواہد گرفت
دستِ شَل مشاطۂ زلفِ سخن خواہد شدن

جو حقیقت ابھی معرضِ وجود میں نہیں آئی اس کے لیے حکماء صوفیہ عدم کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ اور اسے زندگی کے تمام ممکنات کا سرچشمہ سمجھتے ہیں۔ انھیں معنی میں یہ لفظ استعمال کرتے ہوئے غالبؔ کہتا ہے کہ میرے ستارے کو عدم ہی میں اوجِ قبولی حاصل تھا۔ اس لیے جب میرا وجود نہ رہے گا اس وقت زمانے میں میرے شعر کی قدر ہو گی۔

؎ کوکبم را در عدم اوجِ قبولی بودہ است
شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

گانے والے میری غزلیں محفلوں میں گایا کریں گے اور سننے والے جوش و مستی میں اپنے پیراہن چاک کر ڈالیں گے۔ قوالی میں بھی غالبؔ کی غزلیں گائی جاتی ہیں۔ اور کبھی کبھی قوالی سننے والوں کی یہی کیفیّت ہوتی ہے۔ اب غالبؔ کا کلام ریڈیو پر بھی گایا جاتا ہے۔ غالبؔ کے زمانے میں مشاعروں میں تو سو دو سو حاضرین سنتے اور لطف اٹھاتے ہوں گے۔ اب سننے اور سر دھننے والوں کی تعداد بیک وقت لاکھوں تک پہنچتی ہے۔

اس سے اگلے شعر میں ایک عجیب پیش گوئی ہے ؎

حرفِ حرفم در مذاقِ فتنہ جا خواہد گرفت
دستگاہِ نازِ شیخ و برہمن خواہد شدن

جو لوگ جھگڑالو طبیعت رکھتے ہیں جنھیں بحث و جدل میں خاص لطف آتا ہے وہ میرے اشعار کو میدانِ کارزار بنائیں گے۔ میں نے غالبؔ کا شعر علامہ اقبالؔ کے سامنے پڑھا۔ فرمانے لگے دیکھو کس قدر ندرتِ خیال اور قدرتِ اظہار رکھتا ہے۔ بعض طبیعتوں میں واقعی فتنے کا مذاق ہوتا ہے۔ لیکن غالبؔ سے پہلے کسی کو مذاقِ فتنہ کی اصطلاح نہیں سوجھی۔ جن کی فطرت میں مذاقِ فتنہ ہے وہ زندگی کے کسی بھی میدان میں ہوں یہ مذاق پورا کرنا چاہتے ہیں۔ کہیں مال و دولت کے جھگڑے ہیں، کہیں سیاست میں، کہیں مذہب میں چھوٹی بات ہو یا بڑی بات، اپنی تمام قوتیں موافقت یا مخالفت میں صرف کرنے پر آمادہ رہتے ہیں۔ اس مذاقِ فتنہ کا اظہار ادبی زندگی میں بھی کافی فساد پیدا کرتا ہے۔ خود اقبالؔ کے کلام سے بھی یہی ہوا۔ ابھی سے اقبالیت کے بہتّر فرقے پیدا ہو گئے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ وہ فلسفی اور حکیم تھا، کوئی کہتا ہے کہ وہ دینی مبلّغ تھا۔ کوئی یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ تبلیغ نے اس کی شعریت کو بلندی سے پستی میں گرا دیا۔ دوسرا اس کی مخالفت میں کہتا ہے کہ شعر کو دینی حقائق کی پردہ کشائی کے لئے استعمال کر کے وہ عطّار و سنائی اور رومی کا ہم پلّہ بلکہ ان سے بلند تر ہو گیا ہے۔ کوئی اسے صوفی سمجھتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ اس نے تصوّف ہی کے خلاف جہاد کیا ہے۔ اشتراکی بھی اس کا حوالہ دیتے ہیں۔ اور وہ اپنی بندوق اس کے کندھے پر رکھ کر چلاتے ہیں اور فاشسٹی بھی اسے اپنا امام سمجھتے ہیں ہندو اس کا "ہندوستان ہمارا" والا ترانہ گاتے ہیں اور مسلمان "چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا" ذوق و شوق اور جوش و خروش سے الاپتے ہیں۔ کسی کو اس کے انگریزی خطبات میں الحاد کی بو آتی ہے اور کسی کو اسلامی نظریۂ حیات کی دل افروز شرح۔ غالبؔ کے مقابلے میں اقبالؔ کی نسبت یہ کشاکش زیادہ ہے۔ کیونکہ اقبالؔ میں ثروتِ افکار غالبؔ کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے اور اس نے مسائلِ حاضرہ سے ٹکر لی ہے۔ لیکن اپنے متعلق غالبؔ کی پیش گوئی بھی اس بارے میں کسی حد تک

پوری ہوئی۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے فرمایا کہ ہندوستان کے دو ہی الہامی صحیفے ہیں ایک غالبؔ کا کلام (غالباً محض مجموعۂ اردو۔ جس کی نسبت خود غالبؔ کہتا ہے کہ "بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ من است) اور دوسرے وید مقدّس۔ اس رائے کو سامنے رکھنے اور زیرِ بحث لانے سے شیخ و برہمن کا وہی حال ہو گا جو غالبؔ کہ گیا ہے۔ اس کے بعض اشعار ان کے لیے دست گاہِ ناز بن جائیں گے۔ جو کچھ ایک کے لیے محلِّ افتخار ہو گا۔ وہ اسے اپنے خیال کا موید سمجھے گا۔ دوسرا اس کی شرح اور تاویل اپنے انداز میں کرے گا۔ غالبؔ کے فارسی کلام میں متصوّفانہ عقائد بہت ملتے ہیں۔ اور اس کا میلان زیادہ تر وحدتِ وجود کی طرف ہے۔ وحدتِ وجود کا نظریہ ہندی تصوّف یعنی ویدانت میں بھی موجود ہے اور اسلامی تصوّف میں بھی ایک معتدبہ حصّہ ہے۔ شیخ کہے گا کہ یہ اسلامی توحید کی شرح ہے اور برہمن کہے گا نہیں اسلامی توحید میں تو شرک کی آمیزش ہے۔ غالبؔ شنکراچاریہ کی ادویت ویدانت پیش کر رہا ہے۔ کوئی غالبؔ کو حیات بعد الموت کا منکر اور کافر کہے گا اور اس کے ثبوت میں اس قسم کے اشعار پیش کرے گا جس میں اس نے شوخی سے مادی جنّت کو تصوّرِ باطل قرار دیا ہے۔

ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن — دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

تمنّا گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا — وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

یا ایک فارسی تشبیب کے مطلع میں کہتا ہے کہ جنّت کا ذکر ہو رہا تھا اس کے بعد کوئے یار کا تذکرہ آ گیا تو ایسا معلوم ہوا کہ صحرا سے گزر کر لالہ زار کی طرف آ گئے ہیں۔

سخن ز روضۂ رضواں بکوئے یار کشید — چو جادۂ کہ ز صحرا بہ لالہ زار کشید

خود غالب کی زندگی میں لوگوں نے اس کے عقائد اور مشرب کی نسبت جھگڑا شروع کر دیا تھا۔ کوئی اسے دہریہ کہتا تھا۔ غالباً یہ اس کے وحدتِ وجود کے عقیدے کی وجہ سے ہوگا۔ حکیم المانوی شوپن ہار بھی کہتا ہے کہ وحدتِ وجود کا نظریہ دہریت کی شاعری ہے۔ ہمہ اوست کے معنی ہیں کہ خدا نہیں۔ کوئی اسے رافضی کہتا تھا۔ کیونکہ اس نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور اہل بیت کی نسبت جو کچھ لکھا ہے اس سے زیادہ کوئی پیدائشی شیعہ بھی نہیں لکھ سکتا۔ خود ہی ایک رباعی میں ظریفانہ انداز سے کہتا ہے کہ جن لوگوں کو مجھ سے عداوت ہے وہ مجھے دہریہ اور رافضی کہتے ہیں۔ بھلا مجھ ایسا مسائلِ تصوف بیان کرنے والا جو مے خوار نہ ہوتا تو لوگ اسے ولی سمجھتے، دہریہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ اور مجھ سا ماوراء النہری ترک جو کٹر سنّی ہونے میں بدنام ہے رافضی کس طرح ہو سکتا ہے ؎

جن لوگوں کو مجھ سے ہے عداوت گہری — کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری
دہری کیونکر ہو جو کہ ہووے صوفی — شیعی کیونکر ہو ماوراء النہری

غالب کے عقائد پر بحث ابھی تک ختم نہیں ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے آزاد منش شخص پر کوئی لیبل لگانا بہت دشوار ہے۔ حال ہی میں مجھ سے ایک رفیق نے بیان کیا کہ ایک صاحب ان سے فرما رہے تھے میں دین ایمان اور اسلام کا منکر ہو گیا تھا لیکن غالب کے کلام نے مجھے دوبارہ مسلمان بنا دیا۔ اب اس کی نسبت کیا کہا جائے غالب خود کہتا ہے کہ مسلمانوں والی کوئی بات مجھ میں نہیں۔ ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر اور عمر بھر میں ایک مرتبہ نماز پڑھی ہو تو کافر۔ غدر کے بعد مسلمانوں کی پکڑ دھکڑ میں مارشل لا کے انگریز فوجی مجسٹریٹ نے اس سے پوچھا۔ کہ "تم مسلمان ہو"۔ جواب دیا "حضور آدھا"۔ اس نے حیرت سے پوچھا "آدھا کیا مطلب؟" کہا کہ "شراب پیتا ہوں اور سؤر نہیں کھاتا"۔

مختلف عقائد اور مختلف میلانات کے لوگوں کے لیے غالب کے کلام میں سامان موجود ہے۔ انتخابِ کلام سے اسے جو چاہیں بنا دیں۔ کثرت سے افکار ایسے ہیں جنھیں زیرِ نظر رکھ کر عقائد و نظریاتِ حیات کا طویل فتنہ بپا ہو سکتا ہے۔ ہر شخص اپنے نظریے کی تائید میں غالب کا کوئی شعر پڑھ دیتا ہے۔ جن لوگوں کے دل و دماغ میں وسعت اور تصورات میں پرواز ہوتی ہے۔ ان کے افکار میں گوناگونی پائی جاتی ہے۔ یہ لوگ ان کی زندگی کا آئینہ ہوتے ہیں جس میں سب کچھ ہے۔ ایمان کی لہریں بھی ہیں اور کفر کے گرداب بھی خواہشوں کا طوفان بھی ہے اور سکون کی تلاش بھی۔ زندگی کی طرف لپکتے بھی ہیں اور اس سے فرار کی تمنا بھی پیدا ہوتی ہے۔ خدا کی مناجات بھی کرتے ہیں اور شکایت سے دامن کو آلودہ بھی۔

آج تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ شیکسپیئر کا مذہب کیا تھا۔ آئینے کا کیا مذہب ہو سکتا ہے۔ جو نقش اس پر پڑتا ہے آئینہ ہنگامی طور پر اسی سے مصور ہو جاتا ہے۔ عارف رومی کے سوانح میں لکھا ہے کہ مذاقِ فتنہ رکھنے والا ایک ملّا ان کے پاس بغرض مناظرہ آیا۔ اس زمانے کے ایک بڑے شیخ الشیوخ نے اسے جدلیات کے تمام آلات سے مسلح کر کے ان کے پاس بھیجا تھا کہ جاؤ اس مدّعیٔ عرفان کو خوب زک دو۔ اسے بہت پینترے سکھائے کہ اگر یہ یہ عقیدہ بیان کرے تو اسے اس اس طرح رد کرنا۔ اس نے آتے ہی سوال کیا آپ قبل مناظرہ پہلے یہ بتائیں کہ اسلامی فرقوں میں آپ کس فرقے سے ہیں۔ عارف رومیؒ نے جواب دیا کہ میں تو بہتر فرقوں سے متفق ہوں۔ اس قسم کا جواب ملّا کے لیے بہت انوکھا تھا۔ اب وہ اپنے سیکھے ہوئے پینترے بھول گیا اور بھنّا کر بولا کہ سیدھی طرح یہ کیوں نہیں کہتے میں ملحد ہوں؟ مولانا نے جواب دیا کہ مجھے اس سے بھی اتفاق ہے۔ عارف رومیؒ کا درجہ غالب جیسے شعرا سے ہزار درجے بلند ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ بعد کی صدیوں میں عارف رومیؒ سے بھی وہی سلوک ہوا جس کا

SALEEM LIBRARY
I/S Sher ... Gate,
Bine Subhan Khan Lahore.

ذکر غالبؔ نے اس شعر میں کیا ہے۔ بعض لوگ اسے قطب الاقطاب سمجھتے ہیں۔ اور اقبالؔ جیسا مفکر اور صاحبِ بصیرت شخص اس کی مریدی پر فخر کرتا ہے۔ لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جو اسے کافر کہتے ہیں۔ ایک صاحب مثنوی مولانا رومؒ کے جواب میں مثنوی لکھنے بیٹھے تو فخریہ لکھتے ہیں ؎

ایں کلامِ صوفیانِ شوم نیست
مثنویٔ مولویٔ رومم نیست

ایک پنجابی شاعر بھی کہتا ہے کہ رومیؒ اور جامیؒ کو کافر نہ کہیں تو پھر کافر اور کیا ہوتا ہے۔

اسی غزل میں کثرت سے قنوطی اشعار ہیں۔ مطلع میں تو غالبؔ نے زمانے کی بے توجہی سے ایک دل خوش کن نتیجہ نکالا ہے کہ یہ شراب قحطِ خریداری سے پرانی ہو کر اور قیمتی اور سرور آور ہو جائے گی۔ لیکن بعد کے اشعار میں یاس کا پہلو غالب آگیا ہے۔ یک بیک آس سے یاس کی طرف گریز ہے۔ پہلے کہتا ہے جب آئندہ کوئی زمانہ میرے کلام کی طرف راغب ہوگا تو اہلِ ذوق دیکھیں گے کہ میرے صفحات کی سیاہی مشکِ سُودہ اور دوات نافۂ آہوئے ختن ہے۔ لیکن پھر اس کا ذہن اس طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ دورِ حاضر کے میلانات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے یہ پیش گوئی پوری ہوتی دکھائی نہیں دیتی زمانہ ایسی شاعری سے روگردانی کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اگر رفتارِ زمانہ یہی رہی تو جس شاعری پر میں فخر کر رہا ہوں وہ بھٹی میں جھونک دی جائے گی۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ غالبؔ نے سخن کے جن شعبوں میں طبع آزمائی کی ہے ان میں بہت سے ایسے ہیں جن کے لیے جدید دنیا میں کوئی مقام نہیں۔ اور نہ آئندہ توقع ہی ہو سکتی ہے کہ ان کا احیا ہوگا۔ غالبؔ نے قصائد میں بہت زور مارا ہے۔ خاقانی اور عرفی کا حریف بننے کی کوشش کی ہے۔ قصائد میں جھوٹی خوشامد اور دروغ بافی کا ایک طوفان نظر

آتا ہے۔ اگر ان قصائد کی بعض لاجواب تشبیہیں نہ ہوتیں تو وہ سر بسر شاعری کے آثارِ قدیمہ میں داخل ہو جاتے۔ غزلیات میں بھی مصنوعی عاشقی کے خاصے مظاہرے ہیں۔ اور صاف دکھائی دیتا ہے کہ غزل کسی حقیقی تاثر کے ماتحت نہیں کہی گئی بلکہ قافیہ پیمائی اور صنعت کی نمائش ہے۔ چونکہ غالبؔ کو فطرت نے شاعر بنایا تھا اور اس کے ساتھ حکیمانہ طبیعت ودیعت کی تھی۔ اس لیے ایسی غزلوں میں اچھوتے نکتے ملتے ہیں لیکن اب زمانہ زیادہ تر اس دفتر کو دفترِ بے معنی سمجھنے لگا ہے۔ اور یہ میلان کوئی قابلِ تاسف میلان نہیں۔ اچھی شاعری میں حقیقت پسندی ترقی کر رہی ہے۔ لیکن جس شخص نے اپنی فطری استعداد اس میں صرف کی ہو اسے ضرور افسوس ہوگا کہ یہ ساری محنت اور نکتہ سنجی آخر غارت ہو جائے گی۔ غالبؔ کا کمال ان اشعار میں نظر آتا ہے جن میں واقعی اس کا شورِ نفس صورِ نالہ بن گیا ہے۔ ایسے اشعار شدید شوق کی پیداوار ہوتے ہیں اور وہ فن برائے فن کے تحت میں نہیں آتے۔ ایسے ہی سخن کے متعلق وہ اردو میں کہتا ہے کہ

حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

اور فارسی میں روح کی گہرائیوں اور سوزِ قلب سے نکلی ہوئی ایک غزل کے مقطع میں اپنی نفسی کیفیت بیان کرتا ہے ؎

بینی ام از گدازِ دل در جگر آتشے چو سیل
غالبؔ اگر دمِ سخن رہ بہ ضمیرِ من بری

اے پڑھنے والے اگر شعر کہتے ہوئے تو میری اندرونی کیفیت کا معاینہ کر سکے تو دیکھے گا کہ سارا دل پگھل کر اس کا لاوا سیل کی صورت میں جگر کی طرف بہ رہا ہے۔ اسی مضمون کا ایک شعر اقبالؔ کا ہے جس میں اس نے تمام فنونِ لطیفہ کی آفرینش کی نفسیات بیان کی ہیں۔ اور بتایا ہے کہ رنگ ہو یا چنگ ہو یا واسطہ اظہار حرف و صوت

ہو۔ معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

غالبؔ نے بھی اپنی کیفیت اس شعر میں بیان کی ہے کہ ؎

بحفظِ گریہ مشغولم اگر بینی درونم را
زدل تا پردۂ چشم دو شاخِ ارغواں بینی

ضبطِ جذبہ سے ظاہری بدنی کیفیت میں تو شاید کوئی نمایاں تغیر دکھائی نہ دے لیکن اس ضبط سے چشمِ ظاہر کے بجائے چشمِ دل خون کے آنسو ٹپکاتی ہے اور دل سے پردۂ چشم تک دو خونیں لکیریں پڑ جاتی ہیں۔

غالبؔ کہتا ہے کہ جس شخص نے اس قسم کی شاعری کی ہو وہ جب دیکھتا ہے کہ لوگ اب گہرے تاثرات سے بے تاب ہو کر شعر نہیں کہتے، تو اُسے افسوس ہوتا ہے کہ شوق کی زمزمہ آفرینی اور نالہ سنجی کے بجائے اب محض صنعت اور فن رہ گیا ہے اور قلم و رقم کا پیچ و خم معانی کو مجروح و مصلوب کر رہا ہے ؎

ہے چہ می گویم اگر ایں ست وضعِ روزگار — دفترِ اشعار باب سوختن خواہد شدن
آنکہ صورِ نالہ از شورِ نفس موزوں دمید — کاش دیدی کایں نشید شوقِ فن خواہد شدن
کاش سنجیدی کہ بہرِ قتلِ معنی یک قلم — جلوۂ کلک و رقم دار و رسن خواہد شدن
چشم کور آئینۂ دعویٰ بکف خواہد گرفت — دستِ شل مشاطۂ زلفِ سخن خواہد شدن

اصل مضمون وہ ہے جو دل و جان کا شہری ہو جب وہ دل و جان میں سے پیدا نہ ہوگا تو ان کے اندر داخل بھی نہیں ہو سکتا۔

ہر چہ از دل خیزد بر دل ریزد

جب یہ کیفیت نہ رہے گی تو الفاظ اور صنعتیں رہ جائیں گی جن کا دل سے کوئی واسطہ نہ ہو۔ ان میں سے کوئی چیز زبان اور حلق سے نیچے نہ اترے گی۔ اگر یہ

مضامین دل و جان کے شہری نہ رہیں گے تو گنوار بن کر شہرِ قلب کے حدود کے باہر ہی آوارہ پھریں گے ؎

شاہدِ مضموں کہ اینک شہری جان و دل است
روستا آوارۂ کام و دہن خواہد شدن

اس پیش گوئی کی غزل میں دو شعر ایسے ہیں جو انجامِ سخن سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ آنے والے زمانے کے متعلق ہیں۔ کہتا ہے کہ زمانہ جو مذہب و مشرب اور شیوہ ہائے زندگی کے متعلق بے پروا و بے نیاز دکھائی دیتا ہے۔ وہ آگے چل کر ان شیووں کو پرکھنا شروع کر دے گا اور بتا دے گا کہ کون سا شیوہ کتنی قدر و قیمت رکھتا ہے۔ اور انسان کی فطرت میں جو خودی نے حکومت کا میلان پیدا کر رکھا ہے وہ فنا ہو جائے گا۔ اب گبر و مسلمان، شیخ و برہمن نے الگ الگ مخصوص ملتیں اور خلوتیں بنا رکھی ہیں، اور ہر ایک یہ سمجھتا ہے کہ خاص اسرار حیات ایسے ہیں جو ایک خاص ملت کے سینے کا گنجینہ ہیں دوسروں پر فاش نہیں ہو سکتے۔ آئندہ زمانے میں یہ بات نہ رہے گی۔ تمام ملتوں کے عقائد و شعائر ایک دوسرے پر واضح ہو جائیں گے۔ تمام پردے اٹھ جائیں گے ؎

دہرِ بے پروا عیارِ شیوہ ہا خواہد گرفت — داوریٔ خون در نہادِ ما و من خواہد شدن
پردہ ہا از روئے کارِ ہمدگر خواہد فتاد — خلوتِ گبر و مسلماں انجمن خواہد شدن

پیش گوئی صرف نبوت یا ولایت ہی کا حصہ نہیں عالمِ عقلی بھی اس سے بہرہ اندوز ہے۔ سائنس کا سارا مدار پیش گوئی پر ہے۔ اور سائنس کے کسی نظریے کی تصدیق بھی پیش بینی کے درست ثابت ہونے پر مبنی ہے۔ مذکورۂ صدر پیش گوئیاں زیادہ تر عقل اور زمانے کی رفتار شناسی کی بنا پر کی گئیں اور ان میں سے اکثر غالبؔ کے عہد کے بعد دورِ حاضر میں واضح طور پر پوری ہوئیں۔